سوانح اقبال

علامہ اقبال کی وفات پر رسائل کے اداریے

کلیم - دہلی
شاہکار - لاہور
مست قلندر - لاہور
جامعہ - دہلی
اخبار حمایت اسلام - لاہور
معارف - اعظم گڑھ
سب رس - حیدر آباد
زمانہ - کانپور
علی گڑھ میگزین - علی گڑھ
منادی - دہلی

اکبر حیدری کشمیری

مشیت ایزدی کو دیکھیے کہ اقبال کا انتقال اس وقت ہوا جب قوم کا سفینہ طوفانی سیاست کے سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا اور ملت اسلامیہ کو ان کے افکار و خیالات اور تجربات کی اشد ضرورت تھی - ان کا انتقال ۶۱ سال کی عمر میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا - موصوف کی موت سے اسلامی دنیا سیاہ پوش ہو گئی تھی - ملک کے طول و عرض میں تعزیتی جلسے کیے گئے - عقیدت مندوں نے خون کے آنسو بہا دیے - اخباروں اور رسالوں نے ان کے فکروفن اور ملی خدمات پر مفید اور معرکتہ الآراٗ اداریے قلمبند کیے - ان میں بعض ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے اقبالیات میں اچھا خاصا اور قابل قدر اضافہ ہوسکتا ہے- یہ رسائل اب عنقا ہو رہے ہیں - ہم نے نہایت دیدہ ریزی اور جانفشانی سے ان میں سے چند معیاری رسالے حیدر آباد دکن اور لکھنؤ کے کتب خانوں میں ڈھونڈ نکالے ہیں - بعض کی حالت بہت ہی خستہ اور ابتر ہے اور بعض آزادی سے دیمک کی نذر ہو رہے ہیں - تیز دواؤں کی وجہ سے ان کی ورق گردانی اور مطالعہ کرنا اتنا دشوار ہے کہ گویا اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف ہے - دواؤں کی ادنیٰ تاثیر یہ ہے کہ ناک فوراً بہہ جاتی ہے، سر میں درد ہوتا ہے اور آخر میں آواز گلوگیر ہو جاتی ہے-

رسائل کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے مالکان ، مدیران اور صاحبان قلم کے ساتھ علامہ کے تعلقات نہایت مربوط بنیادوں پر استوار تھے - ان کی تحریریں اقبال کے بارے میں دستاویزات کا حکم رکھتی ہیں - یہ رسالے قابل ذکر ہیں :

۱ - کلیم دہلی - ایڈیٹر جوش ملیح آبادی -۲ - معارف اعظم گڑھ - سید سلیمان ندوی- ۳- شاہکار لاہور ، تاجور نجیب آبادی -۴- سب رس ،حیدرآباد -۵- مست قلندر لاہور،ملا رموزی -۶- زمانہ ، کانپور دیا نرائن نگم -۷- جامعہ - دہلی ،ڈاکٹر عابد حسین -۸- علی گڑھ میگزین ، ابواللیث صدیقی -۹- اخبار حمایت اسلام لاہور ، رشید اختر ندوی -۱۰- منادی- دہلی ،

خواجہ حسن نظامی

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جوش ملیح آبادی نے علامہ کی یادگار قائم کرنے کے لیے ''ادارۂ اقبال'' اور تاجور نجیب آبادی نے ''اقبال اکادمی'' کا مطالبہ کیا تھا - شکر ہے کہ اقبال کے انتقال کے عرصۂ دراز کے بعد دونوں بزرگوں کی پیش گوئیاں ''اقبال اکادمی پاکستان'' کے قیام سے پوری ہو گئی ہیں -

ذیل میں متذکرہ بالا رسالوں سے اقبال کے سانحۂ ارتحال کے بارے میں اقتباسات درج کیے جاتے ہیں تاکہ یکجا محفوظ رہ سکیں -

☆☆☆

۱- **کلیم** - دہلی (صفحہ ۳۵۴) بابت مئی ۱۹۳۸ء

جوش ، اپنے اداریے'' اشارات'' کے تحت ''عہد حاضر کی ادبی دنیا کا سب سے بڑا حادثہ- اقبال کی موت'' کے عنوان سے لکھتے ہیں :

''جس وقت ریڈیو نے اقبال کے انتقال کی خبر سنائی ،ایک تیر سا دل وجگر کے پار ہو گیا اور ضبط کی انتہائی سعی کے باوجود میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابلنے لگے - یہ دیکھ کر حضرت آزاد (الطاف احمد تخلص آزاد) نے مجھ سے کہا'' آپ کو اقبال کی قدر اب ہوئی''؟ میں نے جواب دیا ، آزاد صاحب ! کس روز اقبال میری نگاہوں میں ذی قدر نہ تھا- ہر چند مجھے اس کے مسلک و خیالات سے شدید اختلاف تھا ، لیکن اس اختلاف کے باوجود مجھے اس کے شاعرانہ کمال اور اس کی مفکرانہ عظمت سے کب انکار تھا ؟ اقبال ہر حالت اور ہر رنگ میں اقبال تھا - افسوس کہ ہماری شاعری کا آفتاب غروب ہو گیا -

اقبال ان لوگوں میں سے تھا جو صدیوں اور قرنوں کی سعی پیہم کے بعد پیدا ہوتے ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو ، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اس کی روش اور اس کے دائرۂ عمل سے شدید اختلاف تھا - ابتداء میں ہر عظیم شاعر کی طرح اقبال کی شاعری بھی وسیع اور آفاقی شاعری تھی - اس کی نظر دور رس اور اس کا سینہ چوڑا تھا - مگر اس کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر اس کی شاعری کا دائرہ تنگ ہونے لگا ، اور آخر کار یہاں تک تنگ ہو گیا کہ اس کی تمام تر شاعری مذہب تک محدود ہو کر رہ گئی -

آج اقبال ہمارے درمیان موجود نہیں ہے، لیکن جب تک اس دنیا کے کسی گوشے میں علم و ادب کا نام باقی رہے گا، اقبال زندہ و پائندہ رہے گا - اس کے گیت ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرتے رہیں گے اور اس کا نام انسانی ذہن کے افق پر آفتاب کی طرح جگمگاتا رہے گا - اس میں شک نہیں کہ ہندوستان نے اقبال کو اس کے تمام ہمعصر شعراء سے زیادہ سراہا اور سب سے بڑھ کر اس کی قدر کی، لیکن عجیب الخلقت ہندوستان کی قدر شناسیاں محض رسمی اور تفریحی بھی ہوتی ہیں، اور بعض اوقات تو ان کا دائرہ ذاتی تعلقات یا صوبوی افتخار تک محدود ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کی مالی حالت تمام عمر خراب رہی اور بھوپال کے وظیفہ کے باوجود ہمیشہ تنگدست ہی رہا - لیکن اب آسانی کے ساتھ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان اس کی قبر کو زر و جواہر سے پاٹ دے گا - محض اس خوشی میں زر و جواہر سے پاٹ دے گا کہ شاعر مر چکا ہے!

اقبال، بلند مرتبہ اقبال! تو مر گیا - بہت اچھا ہوا - اس کم بخت ملک میں تیری مٹی پلید تھی - ہر چند تیری موت نے ہمارے سینوں کو سنسان اور آنکھوں کو ویران کر دیا ہے، مگر خود تیرے حق میں یہ بہت اچھا ہوا کہ تو مر گیا، اور مر کر ناقدر شناس غلام ہندوستان کی سرد مہریوں سے تو نے نجات حاصل کر لی!

میرے دوستو! کیا اقبال کی موت کو بھی معمولی سمجھ کر ٹال دیا جائے گا - کیا اس عظیم مرتبت انسان کی کوئی یادگار قائم نہیں کی جائے گی - محض کسی شخص کا اسٹیچو نصب کر دینا یا اس کی قبر پر کوئی منارۂ تعمیر کر دینا یا ہر سال مرنے والے کی برسی منا دینا تو کوئی بہتر یادگار نہیں ہے - کیا یہ ممکن نہیں کہ ''دائرہ اقبال'' کے نام سے ایک ایسی مستقل انجمن کی بنیاد ڈالی جائے جو ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں، اپنی شاخیں قائم کرکے، ہر جگہ ترجمہ و تالیف اور تصنیف کا کام جاری کر دے؟ اس انجمن کی بقا کی سب سے زیادہ آسان صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اردو زبان کے ہر سمجھنے اور بولنے والے پر یہ فرض عاید کر دیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی سے صرف ایک روپیہ فی صد سالانہ چندہ دیا کرے - اگر ہندوستان کے وسیع براعظم میں سے جہاں (۳۵) کروڑ انسان آباد ہیں، ہمیں صرف پچاس ہزار آدمی ہی ایسے مل جائیں جو ایک روپیہ فی صد کے حساب سے چندہ دینا شروع کر دیں تو اندازہ لگایئے کہ '' دائرۂ اقبال'' میں کتنی خطیر دولت جمع ہوسکتی ہے، اور اس دولت سے ہم اردو زبان کو کس آسانی اور حیرت ناک سرعت کے ساتھ فروغ دے سکتے ہیں، اور اس کے دوش بدوش اقبال کے متعلقین کی کس قدر خدمت

انجام دی جاسکتی ہے اور ہر سال بہترین تصانیف پر ہم انعام بھی دے سکتے ہیں-

فی صد ایک روپیہ بھی بڑی چیز ہے- اگر پچاس ہزار ایسے ہی آدمی مل جائیں جو صرف ایک روپیہ سالانہ چندہ دیں ، پھر بھی اس دائرے کی آمدنی پچاس ہزار سالانہ ہوسکتی ہے اور پچاس ہزار سالانہ کی رقم بھی اتنی ہے کہ ہم اپنی زبان کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا سکتے ہیں-''

☆☆☆

۲- **معارف** اعظم گڑھ صفحہ ۳۲۲، بابت مئی ۱۹۳۸ء

'' شذرات'' -'' ماتم اقبال'' از سید سلیمان ندوی

'' وقعت الواقعة ''آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا- صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ(۶۱) بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا - وہ ہندوستان کی آبرو ، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا - آج دنیا ساری عزتوں سے محروم ہوگئی - عارف فلسفی ، عاشق رسولؐ ، شاعر ، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدیٰ خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو- اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگ درا ، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم ، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا پر پرواز بال جبریل تھا - اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ ، جاوید نامہ بن کر ان شاء اللہ باقی رہے گا - امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب عرش الٰہی کے سایہ میں ہوگا اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے- خداوندا ! اس کے دل شکستہ کی ، جو ملت کے غم سے رنجور تھا ،غم خواری فرما ! اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلب حزیں کو مسرور کر!

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لاتا تھا - وہ توحید خالص کا پرستار ، دین کامل کا علمبردار اور تجدید ملت کا طلبگار تھا - اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انامؐ کا عشق پیوست تھا، اور اس کی آنکھیں جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں - اس نے مستقبل اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا - اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی -

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ، لب پہ آ سکتا نہیں

کہنے کو تو ہم میں ملت کے غم خواروں کی کمی نہیں اور نہ امت کے دوستداروں کی قلت ،مگر

واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساتھ ستر (۷۰) برس کے طویل عرصے میں دو ہی سچے مسلمان غم خوار پیدا کیے - ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم ، دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو ! ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا اور رسول رحمتؐ کے ساتھ سچا عشق - زمانہ کی جھوٹی آب و تاب اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں - آفتاب اسلام کی ضیا باری کے مقابلہ میں ان کے سامنے جدید تہذیب وتمدن اور زمانۂ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی - خدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے !

اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی - بیسویں صدی کے اس پیغام رساں نے اڑتیس (۳۸) برس کے شاعرانہ پیغاموں سے ملت کے نوجوانوں میں نئی امنگ بھردی اور نئے سفر کے قطع منزل کے لیے ان میں نئے سرے سے ہمت پیدا کر دی - اقبال کا یہ دعویٰ حرف حرف سچا تھا۔

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یاد رہیں گی -وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر ان شاء اللہ زندہ رہے گا- ان کی شرحیں لکھی جائیں گی ،تشریحیں کی جائیں گی، نظریے ان سے بنیں گے- ان کا فلسفہ تیار ہوگا ، اس کی دلیلیں ڈھونڈھی جائیں گی -قرآن پاک کی آیتوں،احادیث شریفہ کے جملوں ،مولانا رومی اور حکیم سنائی کے مآثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا ، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں ان شاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اقبال زندۂ جاوید !

اقبال صرف شاعر نہ تھا - وہ حکیم تھا - وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں ، بلکہ وہ حکیم جو اسرار الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے- وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہوکر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا ، یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر وتسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا -

وفد کابل جن تین ممبروں سے بنا تھا ، افسوس ہے کہ اس میں سے یکے بعد دیگرے دو چل دیے سرراس مسعود اور اقبال - اب صرف ایک رہ گیا ہے ، اور معلوم نہیں کہ وہ بھی کتنے دن کے لیے ہے- آہ !

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کیے تھے - چنانچہ انہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی، ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پر ہو جائے گی - افسوس کہ آج اڑتیس برس کے بعد وہ کرسی خالی ہو گئی ہے، اور اب اس کے بھرنے کی کوئی صورت نہیں !

اقبال ! ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال ،فضل و کمال کا پیکر اقبال ،حکمت ومعرفت کا دانا اقبال ،کاروان ملت کا رہنما اقبال ، رخصت رخصت ،الوداع ، الوداع'!

☆☆☆

۳ - **شاہکار** - لاہور بابت مئی ۱۹۳۸ء ص ۷۰

تاجور نجیب آبادی -شمس العلماً مولانا احسان اللہ خان تاجور ، نجیب آباد کے رہنے والے تھے -۱۸۹۴ء میں نینی تال میں پیدا ہوئے - ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور میں انتقال ہوا - تاجور ادیب ، شاعر اور صحافی تھے - دیال سنگھ کالج ، لاہور میں پروفیسر تھے - اردو مرکز کے مشہور سلسلے کی کتابیں آپ ہی کے اہتمام سے شائع ہوئی تھیں - مدتوں رسالہ'' شاہکار'' لاہور کے ایڈیٹر رہے -'' ہمایوں'' لاہور کے دفتر میں نہایت معمولی تنخواہ پر کام شروع کیا -مخزن ، لاہور کے بھی ایڈیٹر تھے (نقوش ، لاہور نمبر ص ۹۲۴ مطبوعہ ۱۹۶۲ء) رسالہ'' زمانہ'' کانپور بابت اکتوبر ۱۹۴۰ء میں ص ۲۵۷ میں'' علمی خبریں اور نوٹ'' کے تحت درج ہے :

''گورنمنٹ نے امسال نامور اردو ادیب ومحقق علامہ تاجور کو شمس العلماء کا گرانقدر خطاب دے کر اپنی علمی قدردانی کا ایک دل خوش کن ثبوت دیا ہے جس پر ہم اپنے محترم دوست اور قدرشناس وزیر اعظم پنجاب ، دونوں کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں - علامہ تاجور جو فارسی اور عربی کے بلند پایہ ادیب ہونے کے علاوہ علوم قرآن اور فقہ پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں ، اردو ادب کی انہوں نے عظیم الشان خدمت کی ہے -''ادبی دنیا'' اور'' شاہکار'' اور لاہور کے کئی قابل قدر رسالے انہی کی کوششوں سے وجود میں آئے ہیں - اردو مرکز لاہور بھی ان کی ادبی خدمات کا رہین منت ہے - اور اردو ادب کے منتخبات کی ۳۰ جلدوں میں جو اس مرکز سے شائع ہوئی ہیں ، آپ نے صدیوں کے لٹریچر کو نچوڑ کر جمع کر دیا ہے'' -

تاجور نجیب آبادی'' شاہکار'' میں'' اقبال کی موت'' کے تحت لکھتے ہیں :

''اقبال کی موت اس صدی کا سب سے بڑا حادثہ ہے جس سے عالم انسانیت ، دنیائے مشرق، جہان اسلام اور ہندوستان درجہ بہ درجہ ، اپنے قرب و بعد کے اعتبار سے، اثر پذیر ہوئے

ہیں ۔ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ارشاد گرامی ''موت العالم موت العالم'' کے مطابق یوں تو معمورۂ عالم کے گوشے گوشے میں علم و حکمت پر موت طاری ہو گئی ہے، لیکن عالم اسلام تو اس قیامت صغریٰ سے سب سے زیادہ خلفشار کا حصہ دار بن رہا ہے، کیونکہ اقبال کی الہامی تعلیمات کے پہلے مخاطب پیروان اسلام ہی تھے ۔ وہ اصطلاحی معنی میں صاحب شریعت نہ تھا، لیکن اس کی اعجاز نوائی قطعاً پیغمبرانہ انداز رکھتی ہے، بقول گرامی ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اقبال کی موت سے دنیا کا سب سے بڑا مفکر اور فلسفی اٹھ گیا ۔ یورپ اور ایشیا کے بڑے بڑے اہل علم اس سے ملنے کی خاطر بحری و بری سفر کی زحمت گوارا کرتے تھے ۔ اس کا کلام ترجموں کے ذریعہ اقصائے عالم میں سیلاب نور کی طرح پھیل چکا ہے ۔ افسوس ہے کہ وہ اپنے تعلیمی نتائج کو عملی حیثیت میں دیکھنے کی تمنا دل میں لے گیا، لیکن اس صحیح یقین سے پہلے موت اس پر مسلط نہیں ہوئی کہ ایک نہ ایک دن دنیا اس کی آسمانی تعلیمات کو اپنا نصب العین بنائے گی!

ہندوستان کے سطح بیں اشخاص اسے صرف ملت اسلام کا شاعر کہتے ہیں، حالانکہ وہ دراصل ملل و اقوام کا شاعر تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھا، یہ سچ ہے، کیونکہ وہ ساری دنیا کے رہبر کی حیثیت سے تمام عالم کو اپنا وطن تصور کرتا تھا ۔ ہندوستان سے اس کی محبت کسی وطن پرست ہندوستانی سے کم نہ تھی، لیکن وہ وطن دوست ضرور تھا، وطن کا پجاری نہ تھا کہ اس کا جذبۂ پرستاری صرف خدائے واحد کے آستانے کے لیے وقف تھا ۔ دنیا کے موجودہ خلفشار اور اقوام عالم کی باہمی خوں ریزی کے آئینے میں اس نے، سرحدی جھگڑوں کو دیکھ کر، پورے عالم انسانیت سے محبت کرنے کی تعلیم دی ۔ اس کی عالم گیر محبت بڑھتے بڑھتے جغرافیائی حدود سے بلند ہو کر تمام بنی نوع انسان پر چھا گئی ۔ اب اسے حسن اتفاق کہیے کہ اس کی پاکیزہ تعلیم، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی الہامی تعلیمات سے ہمنوا ہو گئی ۔ اسلام کے تصور کو جن تنگ نظر حضرات نے اپنے دل کی بیماری بنا رکھا ہے، وہ اگر اس پر اقبال کو ''ملی شاعر'' کا خطاب دیں تو ''چشمہ آفتاب را چہ گناہ'' ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی مسلم و غیر مسلم اقوام کے ساتھ ہی تمام دنیا کی قوموں سے بھی محبت و ہمدردی کی زندگی بھر تبلیغ کرتا رہا ۔ وہ اپنے وطن ہندوستان کے ساتھ ہی تمام ان ملکوں کو جو غلامی کی ذلیل زندگی بسر کر رہے

ہیں، آزادی اور آزاد زندگی حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے- اگر اسے ہندوستان سے محبت نہ ہوتی تو اپنے مجموعۂ کلام سے ''نیا شوالہ'' اور ''ہندوستاں ہمارا'' کی ولولہ انگیز نظمیں خارج کر دیتا- ایک عام انسان بھی پہلے اپنے نفس سے، پھر اولاد سے، پھر اپنے خاندان، اپنے شہر اور بڑھتے بڑھتے اپنے ملک سے محبت کرنے لگتا ہے- یہ انسانی فطرت کا اقتضاء ہے- پھر اقبال جیسے بلند فطرت انسان سے یہ بعید توقع کیوں کر وابستہ کی جا سکتی ہے کہ اسے اپنے ملک سے محبت نہ تھی- اس کی خدمت میں اکثر اوقات حاضر رہنے والے حضرات جن میں اس کے غیر مسلم نیاز مند بھی شامل ہیں، یہ جانتے ہیں کہ اسے اپنے آبائی وطن کشمیر اور وطن ثانی سیالکوٹ سے بھی محبت تھی- پھر ہندوستان سے، جس کا ایک حصہ کشمیر اور سیالکوٹ بھی ہے، اس کا عالم گیر جذبۂ محبت کیوں کر دامن بچا سکتا تھا- بات وہی ہے کہ انسان کی بلند نظری اس کی فطرت کے ارتقا کا ساتھ دیتی ہے- فطرت میں بلندی کے ساتھ ہی اس کی نگاہ میں بھی رفعت و ہمہ بینی پیدا ہو جاتی ہے-

اقبال کی محبت بھری نگاہیں اس کی بلند فطری کے تقاضے سے جاوید منزل سیالکوٹ، کشمیر، پنجاب اور ہندوستان سے بڑھتے بڑھتے پورے عالم انسانیت پر پڑتی ہیں- مگر افسوس ہے کہ اس کی اس طبعی سعادت کو بھی کم بینوں نے اپنی بے بصری کا سبب بنا لیا ہے!

اقبال، حضرت پیغمبر اسلامؐ سے والہانہ شیفتگی رکھتا ہے کیونکہ وہ اس مقدس آئینے میں صداقت کے ایک جلوۂ راز کو دیکھتا ہے- اس کے کلام میں حجازی نغمے سب سے زیادہ بلند آہنگ ہیں؛ یہاں تک کہ زندگی کی آخری ساعت پر بھی وہ اپنی محبوب ترین تمناؤں کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ؎

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

ارض پاک حجاز اس کا مذہبی گہوارۂ تربیت ہے- حجاز سے اس کی محبت بھی اقتضائے فطری ہے- اگر ہم چین اور جاپان کے محبّ وطن باشندوں کو گیا کے بدھ مندر کی یاترا پر تحسین و آفرین کرتے ہیں تو اقبال یا ہندوستانی مسلمانوں کو ارض حجاز سے اظہار عقیدت پر طعنہ زنی کا ہمیں کیا حق حاصل ہے!

اقبال کی حب الوطنی کسی ہندوستانی محبّ وطن سے کسی درجے میں بھی کم نہیں کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ارشاد ''حب الوطن من الایمان و من احب العرب فقد احبنی'' کے

مطابق وطن سے محبت کرنا جزو ایمان ہے ، اور اقبال حضرت نبی کریمؐ کی تعلیمات کا دنیا میں نقیب اعظم ہے - اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ہندوستان سے محبت نہیں رکھتا ، بڑی دیدہ دلیری بلکہ دریدہ دہنی ہے -نعمت آزادی اور لعنت غلامی کے متعلق اظہار خیالات سے اس کا کلام معمور ہے - اس کی ان تعلیمات کا مخاطب اول درحقیقت ہندوستان ہی ہوسکتا ہے -

اصل یہ ہے کہ اقبال ایسا بلند نظر محبّ وطن ہے کہ اہل ہندوستان کے ساتھ ہی ساری غلام دنیا کو آزادی کا درس دیتا ہے - وہ جب دیکھتا ہے کہ دنیا کی استبداد پسند حکومتیں جوع الارض کے مرض میں مبتلا ہیں اور کمزور ممالک پر تسلط جما کر اپنے اپنے ملکوں کی جغرافی حدود کو وسعت دینا چاہتی ہیں اور اپنے اپنے ملک کو'' وطن پرستی'' کے فریب آمیز الفاظ سے دھوکا دے کر کمزور قوموں کی خوں ریزی پر ابھارتی ہیں تو وہ اس حقیقت نفس الامری کو سمجھ لیتا ہے کہ طاقتور اقوام امن عالم کو اس نام نہاد وطن پرستی کے نام پر زیر و زبر کر رہی ہیں ، اس لیے وہ انسانی برادری کی محبت اور خدمت پر اہل عالم کو ابھارتا ہے - اس پاکیزہ اور محبت آموز تعلیم پر کار بند ہو کر عالم انسانیت امن و امان اور رفاہیت عام کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوسکتا ہے - اقبال کا نعرہ'' تنازع للبقاء'' کی بجائے ''تصالح للحیات'' ہے - یقیناً دنیا ایک نہ ایک دن اسی اصول کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گی !

اقبال کی ساری زندگی قناعت و کم گیری کے زیر اثر بسر ہوئی - وکالت ان کا معاشی مشغلہ تھا - وہ مال و دولت کا حریص ہوتا تو اسی پیشے میں جی لگا کر اسے جاہ و مال کا ذریعہ آسانی سے بنا سکتا تھا -لیکن سرمایہ داری اس کی طبعیت اور تعلیم کے خلاف تھی - اس کے علاوہ وکالت کو کامیاب بنانے کے لیے جن ہتھکنڈوں کی ضرورت ہے ، وہ ان سے متنفر بھی تھا -

قناعت گزینی نے اسے بے نیاز این و آں بنا دیا تھا - اس کی غیور فطرت ان غیر انسانی وسائل سے نفور تھی جن پر تحصیل مال و منال کا انحصار ہے - اس کا اندازہ اس امر واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ مرض الموت میں ایک بڑی ریاست کے وزیر اعظم نے انہیں ایک ہزار روپیہ منی آرڈر کے ذریعہ بھیجا اور ساتھ ہی خط میں ایک فقرہ بھی لکھ دیا کہ میرے کنٹرول میں جو ریاست کا فنڈ ہے ، اس میں سے بھیج رہا ہوں-''Under my Control'' کا فقرہ مرحوم کی غیور طبیعت برداشت نہ کرسکی --- آپ نے منی آرڈر واپس کرا دیا- اس عالم اضطراب میں ذیل کے اشعار ارشاد کیے ؎

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے ، اور شہنشاہی کر
حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات!

حقیقت یہ ہے کہ ۲۱ اپریل کی صبح آباد دنیا کے لیے ایک ہولناک شام غم سے کم نہ تھی - عالم انسانیت کا سب سے بڑا اتحاد و اخوت کا بلند نظر رہنما ، ایسا معجز بیان شاعر جس کے نغمے ازل سے ہم آہنگ تھے ، اسی ظلمت کار صبح نے ہم سے چھین کر موت کے حوالے کر دیا -

اقبال کی زندگی میں اقبال کی رفعت و قدر کا دنیا صحیح اندازہ نہ کر سکی ، لیکن زمانہ جس قدر آگے بڑھتا جائے گا ، اقبال کو پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گا - تہی مغزان امروز اسے نہ سمجھ سکے ، مگر قدر شناسان فردا اس ''شاعر فردا'' کو ضرور سمجھیں گے اور اس کی تعلیم کو راہ مستقبل کے لیے شمع بنائیں گے -

آج تمام ایشیا اور اکثر حصہ یورپ میں اس کا ماتم ہو رہا ہے - ہندوستان ، اور خاص طور پر اسلامی ہندوستان اس بزم ماتم میں سینہ چاک نظر آتا ہے ، لیکن اقبال سے محبت و عقیدت کا مظاہرہ اس سہ روزہ ماتم تک ختم نہیں ہوجانا چاہیے - ضرورت ہے کہ سب مل جل کر'' اقبال اکیڈمی'' کے نام سے اس کی ایک عظیم الشان یادگار جو بیدار مغز نقادوں اور عالی مرتبت مصنفین و مفکرین پر مشتمل ہو ، قائم کریں - اقبال کے ملفوظات مطبوعہ و غیر مطبوعہ غائر نگاہ نقادوں کے بلند تبصروں کے ساتھ لاگت کی برابر قیمت پر اقبال اکیڈمی سے شائع کئے جائیں تا کہ ان کی عام اشاعت ہو - انگریزی ، فرانسیسی ، جاپانی اور عربی میں ان کے صحیح تراجم کی اشاعت کا انتظام کیا جائے ، اور اس طرح مغرب اور مشرق کے گوشے گوشے تک اقبال کا الہامی پیغام پہنچایا جائے - ملک کے ہر صوبے میں ذی اقتدار حضرات کی کمیٹیاں بنائی جائیں اور ان کے زیر اہتمام برطانوی اور ریاستی ہندوستان سے چندہ وصول کیا جائے - ریاستوں کے حکمرانوں سے اقبال اکیڈمی کے لیے مستقل وظائف حاصل کیے جائیں - یہ کام بے دلوں کے لیے مشکل

ہوگا ،لیکن قدر آشنا اور مردان کار ہمت کریں تو اس سال کے ختم تک یہ مہم سر ہوسکتی ہے-

اقبال کسی زندہ قوم کا فرد ہوتا تو اس کی موت پر'' ہائے اور وائے'' کرنے کی بجائے اس کے مشن کے قیام کا اس کی عالم گیر شخصیت کے مطابق انصرام سب سے پہلے ضروری سمجھا جاتا''-

ص ۱۱۲-

''اقبال کی سناونی سن کر'' یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی

کیا پوچھتے ہو حال مسلمانوں کا
دل ہو گیا پامال مسلمانوں کا
اسلام غریب ، ہائے اسلام غریب
رخصت ہوا اقبال مسلمانوں کا!

☆☆☆

۴ - **سب رس** حیدر آباد- بابت جون ۱۹۳۸ء ص ۱۱۰

صغریٰ بیگم صاحبہ حیدر آباد کی نامور سماجی خاتون اور سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر کی اہلیہ محترمہ تھیں - موصوفہ نے ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد سے ایک اردو رسالہ'' النساء'' کے نام سے جاری کیا اور ایک پرچہ اقبال کی خدمت میں روانہ کیا - اقبال نے رسالے کی رسید خط کی صورت میں ۲۸ نومبر ۱۹۲۲ء کو ارسال فرمائی - اس کے بعد دونوں میں خط و کتابت رہی ---- اقبال کے خطوط صغریٰ بیگم کے نام ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب'' شاد اقبال'' میں موجود ہیں-

صغریٰ بیگم'' یاد اقبال'' کے عنوان سے لکھتی ہیں :

''موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ ، کل ہماری باری ہے

سر محمد اقبال مرحوم ہمارے شہر کے رہنے والے نہ تھے ،لیکن ان کے انتقال کی خبر جب حیدر آباد میں پہنچی تو تمام شہر میں بجلی کی طرح گونج گئی - بڑے بڑے تعزیتی جلسے ہونے لگے- نوجوانان دکن نے بہت بڑا جلسہ کیا ، اور گاؤں گاؤں میں جلسے ہوئے - بہت سے اسکولوں میں جلسے ہوئے - سب سے پہلا جلسہ میں نے انجمن خواتین دکن کی جانب سے ۲۵ اپریل کو محل ممتاز یار الدولہ کی صدارت سے اسکول صفدریہ واقع ہمایوں نگر میں کیا - یہ جلسے وغیرہ آخر کس لیے ہوئے ---- اس کی وجہ یہ تھی کہ سر محمد اقبال جب تک زندہ رہے ، انہوں نے اپنا وقت

دوسروں کی بھلائی کے لیے دیا - ایسی ایسی نظمیں جوشیلی لکھیں جن کی وجہ سے ہم بیدار ہوئے - انہوں نے سونے والوں کو جگایا اور اپنے ملک سے محبت کرنا سکھایا- انہوں نے زندگی کس طرح گزارنی چاہیے، بتایا - جو انسان دوسروں کے لیے محنت کرتا ہے، جس کے دل میں خلوص رہتا ہے، اس کی زندگی میں بھی اس کی قدر ہوتی ہے - اس کے بعد بھی اس کی عزت ہوتی ہے- فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر ایران کی تاریخ کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا - اس کی سالگرہ ہزار سالہ ہوئی - اس کی یاد پارسی، مسلمان سب کے دلوں میں تازہ ہے- یہ کس لیے، صرف اس کی نیت اور خلوص کا سبب ہے کہ فردوسی کے مرنے کے بعد سالگرہ ہوئی - لیکن اقبال مرحوم کی وہ عزت ہوئی کہ زندگی میں یوم اقبال منایا گیا - میرے خیال میں کسی شاعر کی زندگی میں ایسی قدر وعزت نہ ہوئی ہوگی - مرنے کے بعد جلسے ہوئے تو کیا، نہ ہوئے تو کیا - مرنے والے کو کچھ اس کی خبر نہیں ہوتی - بقول شاعر ؎

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے
کہ ہم تو یہاں بھی اکیلے رہے

یہ اقبال کی اقبال مندی تھی جو ان کی زندگی میں یوم اقبال منایا گیا - ان کو ضرور خوشی ہوئی ہوگی، بلکہ روحانی خوشی ان کو ان کی زندگی میں حاصل ہوئی - اب بھی وہ مرے نہیں- وہ زندۂ جاوید ہیں - ان کا کلام اور ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا - اقبال کشمیر کے رہنے والے تھے - انہوں نے اپنے بچپن میں جو اشعار کہے، وہ لکھتی ہوں ؎

موتی عدن سے، لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نالۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستان آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور
کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا، وہ جنت نظیر ہے

موت اور زندگی پر مرحوم نے جو اشعار لکھے، وہ قابل داد ہیں ؎

زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا ، کوئی دم چہچہایا ، اڑ گیا
آہ ! کیا آئے ریاض دہر میں ہم ، کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھوٹے ، کھلے ، مرجھا گئے

۱۹۲۳ء تک بیرسٹر صاحب (ہمایوں مرزا) اور سر محمد اقبال صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی - ۱۹۲۸ء میں جب ہم کشمیر گئے ، راستے میں لاہور چند روز ٹھہرنا ہوا - ہمارے ہوٹل کے بازو میں سر محمد اقبال مرحوم کا مکان تھا - پھاٹک پر بورڈ لکھا ہوا تھا - بیرسٹر صاحب ، اقبال سے ملنے گئے - اس کے بعد ان کی بیگم صاحبہ نے اپنی موٹر بھیج کر مجھے بلوایا - میں نے ایک نظم نور جہاں کے مزار پر چڑھانے کے لیے لکھی تھی ، وہ ان کو دکھائی - اس میں مرحوم نے اصلاح دی- اس لیے وہ میرے استاد بھی ہوئے - اور میرے آٹو گراف البم میں سر محمد اقبال صاحب نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جس کا اردو ترجمہ لکھتی ہوں :

''اسلام کی تعریف ، میں چند الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں - ذات باری پر پورا بھروسا ہے، اور موت سے مطلق نہیں ڈرتا'' - (''محمد اقبال لاہور'' - ۱۱ جولائی ۱۹۲۸ء)

اس سے ظاہر ہے کہ ان کے دل میں موت کا ڈر کبھی نہ تھا - ۱۹۲۸ء میں جو میرے آٹو گراف میں لکھا تھا ، وہی جملے ان کے آخر وقت بھی زبان سے نکلے- وہ اپنی بیوی کو کہیں نہیں بھجواتے تھے اور نہ کسی سے ملاتے تھے - دوران گفتگو میں لیڈی عبدالقادر صاحب (ایڈیٹر مخزن لاہور) سے ذکر آیا - میں نے کہا ، میں محمد اقبال صاحب کی بی بی کے ہاں گئی تھی ، انہوں نے چائے پر مجھے بلایا تھا ، تو لیڈی عبدالقادر صاحب کو سخت تعجب ہوا - انہوں نے کہا ہمارے صاحب سے اور محمد اقبال سے بہت دوستی ہے ، مگر آج تک ہم نے بیگم محمد اقبال کو نہ دیکھا ، اور آپ مل آئیں - اس سے ظاہر ہے کہ وہ مہمان نواز دل رکھتے تھے اور مسافر کی قدر ان کے دل میں تھی''-

☆☆☆

۵ - **مست قلندر** ، عورت نمبر ، لاہور - بابت مئی ۱۹۳۸ء

''ڈاکٹر سر محمد اقبال وفات پا گئے''

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کا ترانہ لکھنے والا قومی شاعر ، مشرق کو پیام وطنیت دینے والا پیغمبر ، افسوس ! اب ہمارے درمیان نہیں رہا'' -

''لاہور ۲۱ اپریل - ڈاکٹر سر محمد اقبال آج صبح یہاں وفات پا گئے - گزشتہ تین چار برسوں سے ان کی صحت خراب چلی آتی تھی ، اس لیے وہ تمام پبلک سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے - وہ دمہ کی بیماری میں مبتلا تھے جس نے گزشتہ تین ماہ میں زیادہ شدید صورت اختیار کر لی - آج صبح چار بجے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی - آخری وقت میں ڈاکٹر اور ان کے وفادار ملازم کے علاوہ ان کے تین دوست بھی موجود تھے - شاعر کے آخری الفاظ مندرجہ ذیل تھے :

میں موت سے خوف زدہ نہیں - میں مسلمان ہوں اور خندہ پیشانی سے فرشتۂ اجل کا خیر مقدم کرتا ہوں -

آخری تصنیف غیر مکمل رہ گئی - گو ڈاکٹر اقبال یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ دیر تک جہان فانی میں رہنے کے نہیں ؛ تاہم انہوں نے اپنے ادبی مشاغل کو ترک نہ کیا - موت سے چند ہی روز پہلے انہوں نے ایک شخص کو ملازم رکھا تا کہ وہ اس سے اپنی نئی تصنیف کا مسودہ لکھائیں - ڈاکٹر صاحب شعر بولتے جاتے تھے اور یہ شخص نوٹ کرتا جاتا تھا - یہ تصنیف جو قرآن سے متعلق ہے ، غیر مکمل ہی رہ گئی ہے -

سر محمد اقبال کی یادگار ان کے دو بیٹے اور ایک لڑکی ہے - ان کا نام دنیائے اسلام میں ، اور خصوصاً فارسی اور اردو ادب کے سرکاری حلقوں میں زبان زد عام تھا - ۱۹۳۵ء میں نواب بھوپال نے ان کی ادبی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے لیے تاحیات پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا - تصنیفات -- انہوں نے اردو اور فارسی میں متعدد تصنیفات شائع کیں جن میں ''بانگ درا''، ''پیام مشرق''، ''بال جبریل''، ''اسرار خودی''، ''رموز بیخودی''، ''جاوید نامہ'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ان میں سے بعض جرمن اور دیگر یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں -

ڈاکٹر سر اقبال کی وفات پر ہندوستان بھر میں ماتم منایا جا رہا ہے اور ملک کے سرکردہ اصحاب نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے -

ڈاکٹر ٹیگور کا بیان - کلکتہ ۲۱ اپریل - ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے جب سر اقبال کی موت کی خبر سنی تو کہا :''ڈاکٹر اقبال کی وفات سے دنیائے ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جو ایک مہلک زخم کی طرح پر ہونے کے لیے بہت طویل عرصہ لے گا - ہندوستان کی جگہ بہت تنگ اور محدود ہے اس لیے ایک ایسے شاعر کی موت کا صدمہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہے جس کی

شاعری عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔''

ڈاکٹر اقبال کی آخری رباعی

مرنے سے کچھ لمحے پہلے ڈاکٹر اقبال نے ذیل کی رباعی کہی جسے ان کی زندگی کی آخری نشانی سمجھنا چاہیے۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید
(اصل ''باز'')

☆☆☆

۶ ۔ **زمانہ** ۔ کانپور بابت اپریل ۱۹۳۸ء ص ۲۷۸

ڈاکٹر اقبال مرحوم

'' ۲۱ اپریل کو صبح پانچ بجے شاعر اعظم ڈاکٹر اقبال کے انتقال پر ملال سے اردو ادب کو جو صدمۂ عظیم پہنچا ہے اس پر تمام ملک میں ماتم برپا ہے ۔ ڈاکٹر اقبال موجودہ زمانہ کے سب سے بڑے اردو شاعر تھے ، اور گو کئی سال سے اردو کی بہ نسبت فارسی کلام کی طرف ان کی توجہ بہت زیادہ مبذول ہو گئی تھی ۔ تاہم اردو میں جو کچھ لکھ دیتے تھے ، وہ اس ہر دلعزیز زبان کے لیے مایۂ ناز و باعث فخر ہوتا تھا ۔ ایک عرصے سے آپ کی صحت خراب تھی اور مہینوں سے علالت کا سلسلہ برابر جاری تھا جس سے بے حد نقاہت ہو گئی تھی ؛ تاہم کسی کو بھی یہ اندیشہ نہ تھا کہ آپ کا انجام اس قدر قریب ہے ۔

ابھی جنوری گزشتہ میں ہندوستان کے اکثر شہروں میں معتقدین اقبال نے '' اقبال ڈے'' منایا تھا ۔ ہم نے بھی زمانہ مارچ ۱۹۳۸ء میں '' اقبال کی شاعری اور تصوف'' پر دو خاص مضامین شائع کیے تھے جن کو ہمارے دو عزیز دوستوں نے ہماری استدعا پر بڑی کاوش و تحقیق سے لکھا تھا ۔ آہ ! کس کو خبر تھی کہ اس اظہار عقیدت مندی اور مضامین کی اشاعت کے بعد اس قدر جلد یہ شاعر اعظم داعی اجل کو لبیک کہہ کر اپنے مشتاقان کمال کو ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے جائے گا ۔ مگر خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے ۔ سچ ہے۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

اس حادثے نے طبیعت کو افسردہ کر دیا ہے کیونکہ گو علالت اور عدیم الفرصتی کے باعث ایک عرصہ سے زمانہ کو ڈاکٹر اقبال کے کلام کی اشاعت کی عزت نصیب نہیں ہوسکی؛ تاہم یہ ناچیز رسالہ آپ کی خدمت میں ہمیشہ باریاب ہوتا رہتا تھا، اور آپ نے اس کے ''جوبلی نمبر'' اور اس کے خاص نمبروں کے لیے اپنے اشعار عطا فرمائے تھے- ۱۹۰۴ء میں آپ نے اپنا مشہور گیت ''ہندوستاں ہمارا'' کا صحیح ایڈیشن بھی سب سے پہلے زمانہ ہی کو اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا تھا-

کلام اقبال پر زمانہ میں کئی مفصل تبصرے شائع ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے- لیکن اب ان مضامین کو کون داد دے گا- اصل یہ ہے کہ اقبال کا اردو میں کوئی جواب پیدا نہیں ہوا ہے- ان کے کلام میں میر تقی میر کا سوز و گداز، خواجہ درد کا تصوف اور مرزا غالب کا حکمت و فلسفہ کچھ اس طریقے سے یکجا ہو گیا تھا کہ اس کی نظیر کم سے کم اردو میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتی ہے-

ان کی پیدائش کی تاریخ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء تحقیق ہوئی ہے- اس حساب سے موت کے وقت آپ کی عمر ۶۵ سال دو ۲ ماہ تھی- کہتے ہیں وفات سے کچھ قبل آپ نے یہ اشعار ارشاد فرمائے تھے ؎

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگار این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ لوح مزار پر نقش کرانے کے لیے خود ہی یہ قطعہ کہا تھا ؎

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود''

☆☆☆

''**زمانہ**'' کا پہلی مرتبہ فروری ۱۹۰۳ء میں اجراء ہوا تھا - فروری ۱۹۲۸ء میں اس کی جوبلی منائی گئی- دیا نرائن نگم ، جوبلی نمبر میں'' علامہ اقبال اور زمانہ '' کے تحت لکھتے ہیں :

''علامہ اقبال بھی زمانہ کے اولین قلمی معاون ہیں - آپ کا مشہور و معروف قومی ترانہ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' سب سے پہلے''زمانہ'' میں ستمبر۱۹۰۴ء کے پرچے میں شائع ہوا تھا - اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً آپ کی قلمی عنایات کا سلسلہ جاری رہا - چنانچہ ۱۹۲۵ء میں زمانہ کا جو قومی نمبر شائع ہوا تھا ، اس کے لیے آپ نے یہ شعر خاص طور پر عنایت فرمایا تھا ؎

نہ کنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم
بسراغ صبح فردا روش زمانہ دارم

☆☆☆

۷- **جامعہ ملّیہ**، دہلی

سید نذیر نیازی اپنے ایک مضمون'' اقبال اور جامعہ'' میں لکھتے ہیں :

'' ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور اس کا افتتاح حضرت شیخ الہند کے بابرکت ہاتھوں نے کیا - اس کے ساتھ ہی ، اور غالباً اسی روز مولانا مرحوم نے اقبال کو تار دیا کہ علی گڑھ آئیں اور جامعہ کی تعلیمی ذمہ داریاں سنبھالیں- اقبال نے شیخ الجامعہ کا عہدہ قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی ، تو جامعہ ان سے روٹھ گئی- ۱۹۲۵ء میں جامعہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوئی تو اقبال سے روابط کا دوسرا دور شروع ہوا - اقبال کی نظمیں رسالہ جامعہ میں چھپنا شروع ہوئیں -

علامہ کو جامعہ ملیہ سے ہمیشہ ہمدردی رہی تھی - ۱۹۲۷ء میں اس کی امداد کے لیے جو اپیل کی گئی تھی ، اس پر صرف پانچ چھ اشخاص کے دستخط تھے جن میں علامہ بھی شامل تھے- مارچ ۱۹۳۳ء میں امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر جنگ طرابلس اور بلقان کے نامور مجاہد یعنی مشہور ترک محبّ وطن غازی رؤف پاشا جامعہ کے توسیعی خطبات کی صدارت کے لیے دہلی تشریف لائے اور یہاں صرف دو روز ٹھہرے- یعنی ایک صبح کو آئے اور دوسری صبح واپس چلے گئے - پھر ۱۵ اپریل (سال مذکور) ۵ بجے شام کو جامعہ تشریف لائے اور جامعہ کی انجمن اتحاد کا سپاس نامہ قبول فرمایا -اس کے جواب میں چند کلمات سے لوگوں کو محظوظ کیا - اسی دن ساڑھے آٹھ بجے شب کو موصوف نے اپنے سفر یورپ کے حالات پر تقریر کی - اس کا موضوع تھا

''لندن سے غرناطہ تک'' - اس کے دو دلچسپ حصے تھے - ایک وہ جس میں آپ نے فرانس کے مایہ ناز فلسفی برگسان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا - دوسرا وہ جس میں آپ نے جدید اسپین کے حالات بیان فرمائے - خصوصاً اس رجحان پر روشنی ڈالی جو وہاں کے باشندوں کو اسلامی تمدن کی طرف تھا - آپ کا قول تھا کہ جو لوگ تہذیب اور معارف اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے، ان کے لیے اسپین میں جا کر رہنا ناگزیر تھا، اور انہیں وہاں کی حکومت اور وہاں کے ارباب علم سے ہر طرح کی مدد مل جائے گی -

علامہ ۱۹۳۴ء میں بیمار ہوئے اور دل کے عارضے نے ضیق الدم کے علاوہ حبس گلو کی شکل اختیار کر لی جس سے وہ ہمیشہ کے لیے صاحب فراش ہو گئے - لیکن اس کے باوجود ۱۹۳۵ء کے آغاز میں جب ان کا مرض ابھی زیادہ نہیں بڑھا تھا، پھر وہ جامعہ تشریف لائے اور ایک مشہور ترک خاتون خالدہ ادیب خانم کے ایک خطبہ کی صدارت کی - گو آواز کی خرابی کے باعث رسمی طور پر چند کلمات کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکے'' -

(حوالے - جوہر جوبلی نمبر، مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی مرتبہ محمد عرفان خان نوری
جامعہ دہلی، جلد ۲۰ نمبر ۴ بابت اپریل ۱۹۳۳ء صفحہ ۳۸۶

☆☆☆

جامعہ، دہلی، جلد ۲۹ نمبر ۶ بابت جون ۱۹۳۸ء صفحہ ۵۲۳

علامہ کے انتقال پر جامعہ کے ایڈیٹر ڈاکٹر عابد حسین نے یہ تاریخ کہی تھی ۔

'' قطعہ تاریخ وفات علامہ اقبال مرحوم''

لطف مجلس کیا رہا جب میر مجلس اٹھ گیا
وائے ناکامی کہ بزم اہل دل برہم ہے آج
تھا جہاں کل نغمۂ مستانہ کا جوش و خروش
ہے وہاں آہ مسلسل، نالۂ پیہم ہے آج
سینۂ مسلم کہ تھا گنجینۂ شوق امید
ہے وفور یاس اس میں اور ہجوم غم ہے آج
فکر کی جب سال رحلت کی تو دل نے دی صدا
''ملت اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج''
۱۳۵۷ ہجری

ایضاً صفحہ ۵۲۳ -'' ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم'' --- ڈاکٹر محمد مجیب بی - اے آکسن

'' ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی آخری سانس میں فرمایا تھا کہ مسلمان کی نشانی یہ ہے کہ موت آئے تو مسکراتا دیکھے اور موت نے ان کے ایمان کو اتنا ہی پختہ پایا جتنا کہ زندگی نے- ہم موت سے ڈرنے اور بھاگنے والے بھلا ماتم کا اتنا سلیقہ کہاں سے لائیں گے کہ ایسے مرنے والے کا حق ادا کرسکیں - ڈاکٹر مرحوم نے عمر بھر ہمیں جینے کے گر سکھائے اور ان کے دن پورے ہو گئے ،تو مرنے کا ایک طریقہ بھی بتا گئے کہ ہزار زندگی سے بہتر ہے- خدا کرے جینے کی یہ مثال زندہ رہے اور مرنے کی یہ مثال-

در اصل اس وقت جب محبت اور عقیدت جوش پر ہے اور مرحوم کی صورت بار بار آنکھوں کے سامنے آ رہی ہے ،ہمیں چاہیے کہ ان کی صورت اور شخصیت کا ایک ایسا خاکہ بنا کر محفوظ کر لیں جسے برسوں بعد دیکھنے پر بھی ہم پہچان سکیں اور دنیا بھی مان لے کہ اس کا ہر نقش اصل سے ملتا ہے- یہ کام محبت اور عقیدت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ،لیکن اس کے لیے محبت اور عقیدت ہی کافی نہیں ہیں - محبت اپنی ہی آنکھ سے دیکھتی ہے- دوسرے کے نقطۂ نظر کی پروا نہیں کرتی اور عقیدت کو سہرے پہنانے کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ وہ اکثر آدمی کی صورت ہی چھپا دیتی ہے - اس طرح کی تعریف اگر دو چار خصوصیتوں کو ابھارتی ہے تو بہتری مٹا بھی دیتی ہے- ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شخصیت کا صحیح خاکہ بنانے کے لیے تنقید کا ضبط بھی درکار ہے - کیونکہ اس وقت عقیدت اور تعریف صورت گری کی ہر مشکل آسان کرسکتی ہیں تو آگے چل کر یہی آسانی ہزار مشکلیں پیدا کر دے گی -''

اس کے بعد مجیب صاحب لکھتے ہیں :

'' مثنوی اسرار و رموز میں ڈاکٹر اقبال نے شخصیت کی تعمیر کے تمام گر بتائے ہیں اور حکایتوں اور مکالموں اور مقالوں سے ثابت کیا ہے کہ انسان کا دل جس فلاح اور نجات کا آرزو مند ہے وہ صرف جسمانی اور روحانی قوت سے حاصل ہوسکتی اور اپنے اندر یہ قوت پیدا کرنا خودی ہے -لیکن انسان کامل اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ خودی سے بھی گزر کر انسانیت کے اعلیٰ اخلاقی مقاصد میں اپنی ذات اور اپنے ارادے کو کھپا دے- اپنی خودی کو بے خودی میں ڈبو دے اور اسی کو اپنا کمال اپنی نجات اور اپنے وجود کا اصل مقصد جانے - خودی کے لیے شخصی ارادے کی ضرورت ہے- بیخودی کے لیے

ایسی ملت ایسے اخلاقی مقاصد اور ایسا دین چاہیے جو افراد میں خودی کا حوصلہ پیدا کرے اور ایک بڑا میدان فراہم کرے کہ اس میں وہ اپنی صلاحتیں استعمال کر کے بے خودی کا جام پئیں- اقبال کے نزدیک اسلام خودی اور بے خودی کی اس تعلیم کا نام ہے اور ملت اسلامی کی بڑی شخصیتوں نے جو مرتبہ حاصل کیا اور انسانیت کی جو خدمت کی اس کا راز بھی یہی ہے- اس تعلیم میں اقبال کا حصہ یہ ہے کہ انہوں نے مذہب تصوف اور تاریخ سے رس کی طرح نکال کر ایک رنگین اور مد بھری شراب بنا دیا کہ اسے دیکھتے ہی چکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے اور جس نے ایک بار بھی پیالہ منہ سے لگایا وہ پھر اسے مست ہو کر ہی چھوڑتا ہے- مثنوی ''اسرار و رموز'' میں علم ، اخلاق اور دین کے مسئلے بیان کیے گئے ہیں - لیکن ایسے شاعرانہ انداز ، ایسی محبت اور ایسے درد کے ساتھ پڑھنے والا خیالات کی گہرائی دیکھ کر جھکتا نہیں- بلکہ اس میں شوق سے غوطے لگاتا ہے''

☆☆☆

۸- **علی گڑھ میگزین** اقبال نمبر بابت اپریل ۱۹۳۸ء

ملک کے طول و عرض کی طرح ۲۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو اقبال کی زندگی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی یوم اقبال شایان شان طریقہ سے منایا گیا تھا - اس موقع پر جو مقالے اور نظمیں پڑھی گئیں ، وہ ایڈیٹر صاحب ابواللیث صدیقی نے مرتب کر کے علی گڑھ میگزین اقبال نمبر کی صورت میں شائع کیں - میگزین کا یہ اسپیشل نمبر اپنی جدت کے لحاظ سے اقبالیات میں دوسرا اقبال نمبر تھا - اس سے چند سال پہلے نیرنگ خیال لاہور کا اقبال نمبر شائع ہو چکا تھا - علی گڑھ میگزین کے اقبال نمبر میں لکھنے والے علی گڑھ کے اساتذہ اور طالب علم تھے - اس شمارے میں اقبال کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں کے عکس بھی موجود ہیں - ڈاکٹر عبدالحق ''اردو'' سہ ماہی'' اقبال نمبر'' بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء کے صفحہ ۲۷۷ میں لکھتے ہیں :

'' یہ نمبر اقبال کی وفات کے بعد ہی فوراً شائع ہوا - خیال ہوا کہ علی گڑھ والوں نے کمال کیا کہ اتنی جلدی اقبال نمبر مرتب کر کے شائع کر دیا ،لیکن شذرات پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ۲۹ جنوری کو علی گڑھ یونیورسٹی میں جو یوم اقبال منایا گیا تھا اور اس میں جو مقالے ،نظمیں پڑھی گئیں اور جو تقریریں کی گئیں ، وہی جمع کر کے اقبال نمبر کی صورت میں شائع کر دیا گیا -

یہ اقبال کے کلام اور خیالات پر نظم و نثر کا بہت نفیس مجموعہ ہے ، اور ان تمام مضامین کے لکھنے والے علی گڑھ ہی کے ہیں - یہ نمبر مطالعہ کے قابل اور بہت پاکیزہ چھپا ہے''-

اقبال نمبر اپریل کے دوسرے ہفتے میں چھپ گیا تھا -صفحہ ۱ میں ایڈیٹر صاحب کا ذیل کا انتساب بھی چھپا تھا:

''شاعر مشرق ، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی خدمت میں ،علی گڑھ کا یہ ہدیۂ عقیدت''

ابواللیث صدیقی یہ خصوصی نمبر علامہ اقبال کی خدمت میں پیش کرنے ہی والے تھے کہ علامہ کا انتقال ۲۱ اپریل کو ہوا - موصوف کو نہایت حزن و ملال سے میگزین کی ابتدا میں کئی صفحوں کا اضافہ کرنا پڑا - چنانچہ ''آہ اقبال'' کے تحت ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو لکھتے ہیں :

''آج اس نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہا ہے اور قلم تھراتا ہے - آہ، کسے معلوم تھا کہ مشرق کی امیدوں کا یہ آفتاب موت کی بدلی میں اس قدر جلد چھپ جائے گا - ہندوستان میں مولوی پیدا ہوں گے ، عالم پیدا ہوں گے ، شاعر اور ناظم پیدا ہوں گے ،فلسفی پیدا ہوں گے -لیکن دوسرا اقبال پیدا نہ ہو گا - اس پر ہندوستان کو ناز تھا ، بلکہ دنیائے اسلام کے لیے اس کا وجود باعث فخر تھا-

میگزین کی طباعت کے آخری مراحل طے ہو کر شیرازہ بندی شروع ہو چکی تھی کہ ۲۱ اپریل کی شب میں اس سانحہ عظیم کی خبر پہنچی - افسوس کہ علی گڑھ کا یہ ہدیۂ عقیدت علامہ موصوف کی بارگاہ میں ان کی حیات میں پیش نہ ہو سکا -

جس نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے مقابلے میں اپنے جادونگار قلم سے سد سکندری قائم کر دی تھی ، جس کی ذات الحاد اور بے دینی کی عالم گیر وبا میں ہماری محافظ تھی، جس کا وجود ہم تن آسانوں میں جدو جہد اور عمل و استقلال کا انقلاب پیدا کر رہا تھا ، آج رخصت ہو گیا - ہماری امیدوں کا یہ سب سے روشن چراغ تھا جسے موت کے ظالم ہاتھوں نے گل کر دیا''-

میگزین میں مولانا احسن مارہروی کی ایک طویل نظم ''نذر اقبال'' موجود ہے- انہوں نے اقبال کے انتقال کے فوراً بعد مورخہ ۲۳ اپریل ایک اور نظم ''قطعہ تاریخ انتقال ڈاکٹر سر محمد اقبال'' لکھی - آخری دو شعر یہ ہیں ؎

ہے دعا تربت پہ اس کی پھول برساتی رہے
مرحمت اللہ کی ، الفت رسولؐ و آل کی
کہیے احسن سال رحلت اور کیا اس کے سوا
ہے زوال علم و حکمت مرگ سے اقبال کی
۱۳۵۷ ہجری

☆☆☆

۹ - **اخبار** حمایت اسلام لاہور جلد ۱۴ ،نمبر ۱۸ - یوم پنجشنبہ ۴ مئی ۱۹۳۹ء ایڈیٹر رشید اختر ندوی

'' رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے''

۲۰ اپریل ۱۹۳۹ء - آج پورے ایک سال کا زمانہ گزرا کہ '' میکدۂ اسلام'' کا یہ بدمست ساقی ''ساقی کوثر'' کے عشق و محبت میں سرشار حیات مستعار سے بیزار ،ملک فنا کو چھوڑ چھاڑ ، راہی ملک بقا ہو گیا -'' انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ''! جس نے مرنے والے کو دنیا میں '' بااقبال'' رکھا '' با اقبال'' اٹھایا ، وہ آخرت میں بھی اس کو اپنی رحمت سے سرفراز کرے ، اور اپنی مغفرت کی نعمت سے مالا مال کرے - آمین !

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

شاعر اسلام اور ان کے متعلق جو رائے چاہے ، قائم کرے لیکن جس نے اقبال کو ان کے عشق دردمند کے آئینے میں دیکھا ہے ، وہ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اقبال کا اصلی جوہر ، ان کی سب سے بڑی کامیابی ، اور ان کا سب سے بڑا کمال مذہب پرستی ، اسلام کی شیفتگی اور ملت بیضا کی غمگساری ہے -

اسلام کا شاندار ماضی ، عبرتناک حال اور خوفناک مستقبل ان کے پیش نظر تھا - وہ خود تڑپتے تھے- دوسروں کو تڑپاتے تھے - خود روتے تھے - دوسروں کو رلاتے تھے - آنکھ اٹھا کر دیکھ لو ، قرطبہ و غرناطہ کے کھنڈروں پر کون خون کے آنسو بہا رہا ہے - بغداد اور اندلس کی یاد کس کے عیش کو رنج سے بدل رہی ہے - دلی مرحوم کی ویرانی کس کے دل کو برمائے دے رہی ہے - ذرا کان لگا کر سننا مجدد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر کھڑا کون صدائے نالہ وشیون بلند کر رہا ہے اور زائر مدینہ کے ذریعے سرکار مدینہ میں کیا پیغام بھیجا جا رہا ہے - اللہ اللہ ! اس مذہبی دیوانے کی شوریدہ سری کا کیا ٹھکانا ! اس کا جوش جنوں اسے کہاں کہاں نہ لے گیا !

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

اقبال یورپ گیا - لیکن وہ دوسروں کی طرح یورپ سے مرعوب نہیں ہوا - بلکہ اسلام اور علوم اسلامیہ کی یاد وہاں بھی اس کے ساتھ رہی - وہاں بھی وہ تڑپا اور دین و ملت کی یاد میں مصروف گریہ و ماتم رہا ؎

مگر وہ علم کے موتی ، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

غلط فہمی نہ ہو، اقبال ، مرزا انیس (کذا) و دبیر کی طرح محض مرثیہ خواں نہ تھے- اس بندۂ خدا نے تو مرثیہ خوانی کے پردہ میں ملت بیضا کی پاسبانی کا کام انجام دیا - اس نے اپنی آہوں کو ''نفخ صور'' کا ہم پلہ بنایا اور آنسوؤں کے چھینٹوں سے مدت کے بخت خفتہ کو بیدار کیا - اس نے امت کے نوجوانوں سے صاف صاف احساس وشعور اور عمل کا مطالبہ کیا- علی الاعلان کہہ دیا ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے ، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل ، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

شرکائے بزم !

مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے - کہ یہی ولولہ ، یہی جوش حریت اور یہی مطالعۂ احساس و عمل درحقیقت اقبال کی زندگی کا وہ روشن ترین پہلو ہے کہ جس کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے میں ملت اسلامیہ کا بہترین نفع مضمر ہے کہ ملت بیضا کا حقیقی مفاد اسی انقلاب ---- اور پرکیف نغمات سے وابستہ ہے- ضرورت اس امر کی ہے کہ فرزندان امت محمدیہ کو اقبال ہی کے طرز میں اقبال ہی کے درد میں ، ان کے حقیقی منصب سے مطلع کیا جائے ، راز حیات سے آشنا کیا جائے کہ امت کے نوجوانوں کی بیداری درحقیقت امت ہی کی بیداری ہے-

نوجوانان ملت !

مردوں کا ماتم کرنا '' مردہ قوم'' کا شیوہ ہے-'' زندہ قومیں'' تو ''مردوں'' کو زندہ کر دیتی ہیں - پس اگر تم '' زندہ'' ہو تو اقبال کے مشن کو زندہ کردو - امت کے بخت خفتہ کو بیدار کردو - ملت کے جسم مردہ میں زندگی کی روح پھونک دو - دیر کیوں ہو رہی ہے؟ ''میکدۂ اسلام'' کی جانب آؤ -خم کے خم چڑھاؤ اور دیوانہ وار ، اللہ کے واسطے ، میدان عمل میں آ جاؤ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سچ ہے اقبال سا ''دیدہ ور'' مسلم ہندوستان کو بہت کچھ کھونے کے بعد ملا تھا - پس مبارک ہیں وہ جو اقبال کی اصل تصویر دیکھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں - (اخبار آفتاب ، لکھنؤ)

☆☆☆

۱۰ - **منادی** - دہلی، خواجہ حسن نظامی، اپریل ۱۹۳۸ء

خواجہ حسن نظامی مرحوم علامہ اقبال کے معتبر اور مخلص ترین دوستوں میں تھے - وہ صف اول کے ممتاز ادیب، بے شمار تصنیفات کے مصنف اور مایہ ناز صحافی تھے - انہوں نے متعدد رسائل و اخبارات جاری کیے - ان میں سے توحید میرٹھ، خطیب دہلی، نظام المشائخ دہلی، منادی دہلی قابل ذکر ہیں -

پرانے، نادر و نایاب رسالوں میں موصوف کے لاتعداد مضامین میری نظر سے گزرے ہیں - خواجہ صاحب بسیار نویس اور صاحب طرز انشا پرداز تھے - وہ شرافت اور رواداری کے مجسم تھے - جب اقبال سفر ولایت کے سلسلے میں ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو بمبئی میل میں دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو خواجہ صاحب نے ان کا استقبال کیا اور ان کے ساتھ درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ تشریف لے گئے - یہاں اقبال نے ۳۶ شعر کی ایک طویل نظم پڑھی جو ''التجائے مسافر'' کے عنوان سے مخزن لاہور جلد ۱۰ نمبر ۱۰ (ص ۴۹) بابت اکتوبر ۱۹۰۵ء میں نیرنگ انبالوی کے تفصیلی نوٹ کے ساتھ موجود ہے - ذیل میں چند شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال
مرید پیر نجف ہے، غلام ہے تیرا
مرے سفینے کو تونے کنارہ بوس کیا
اماں نہ دیتا ہے غنچے کا آشیاں مجھ کو
یونہی بنی رہے محفل مرے احبا کی
ہرا بھرا نظر آئے یہ بوستاں مجھ کو
بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو
قسم ہے اس کے دل درد مند کی آقا
تری ثنا کے لیے حق نے دی زباں مجھ کو

اقبال جب یورپ کی واپسی پر ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء کو دہلی پہنچے تو اور لوگوں کے علاوہ خواجہ حسن نظامی نے ان کا استقبال کیا اور ان کے ساتھ درگاہ نظام الدینؒ میں حاضری دینے کے لیے گئے - اس کی تفصیلات میر نیرنگ نے اپنی نظم '' ترانۂ مسرت یعنی آمد اقبال' کے تمہیدی

نوٹ میں بیان کیں جو مخزن جلد ۱۵ نمبر ۵ (ص ۶۲-۶۳) بابت اگست ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی - خواجہ صاحب نے اقبال کو ۱۹۱۵ء میں ''سرالوصال'' کا خطاب دیا اور انہی نے اسرار خودی کا نام تجویز کیا تھا - خواجہ صاحب نے ۱۳۵۵ہجری (مطابق ۱۹۳۶ء) میں میلادی جنتری مرتب کر کے شائع کی - اس میں انہوں نے اقبال کا قلمی چہرہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا -

خواجہ صاحب کو اپنے رسائل و اخبارات میں کلام اقبال کو شائع کرنے کا بھی شرف حاصل تھا- وہ ان کے اشعار پر تبصرہ بھی کیا کرتے تھے - انہوں نے ''منادی'' ہفتہ وار اخبار کی حیثیت سے ۱۹۲۶ء میں جاری کیا جو بعد میں ماہنامہ رسالے کی صورت میں چھپنے لگا تھا - اس کے متعدد شمارے سالار جنگ میوزیم میں میری نظر سے گزرے ہیں -

''منادی'' مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۳۸ء کالم ۳ صفحہ ۶ میں خواجہ صاحب نے مولوی حسین احمد مدنی صاحب کی تقریر کا ذکر بھی کیا جس کا عنوان تھا: ''قوم مذہب سے نہیں بنتی'' موصوف نے عوام کی آگہی کے لیے علامہ کے وہ شعر بھی درج کیے ۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ، ورنہ
ز دیو بند حسین احمد ! ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفٰی برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نر سیدی ، تمام بولہبی است

جب علامہ اقبال کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا تو انہوں نے ''منادی'' کے ۲۲ اپریل کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی :

''آج ۲۱ اپریل کی صبح کو دلی ریڈیو نے یہ المناک خبر سنائی کہ تمام اسلامی دنیا کے مسلمہ قومی شاعر نے ، جنہوں نے ساری اسلامی دنیا میں ترقی و زندگی کی لہر پیدا کر دی ، اس دنیا سے انتقال فرمایا - یہ خبر نہ صرف دنیا بھر کے مسلمانوں کو غمگین کرنے والی ہے ، بلکہ ایشیائی قوموں کو اس کا صدمہ ہوگا کیونکہ مرحوم اقبال ، ایشیا کی پرانی تہذیب کے حامی اور مددگار تھے ، اس لیے ان کی وفات سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی'' -

اس کے ایک ہفتہ بعد خواجہ صاحب ہفت روزہ ''منادی'' دہلی مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء

مطابق ۲۷ صفر ۱۳۵۷ھ کو پھر لکھتے ہیں :

''اقبال کے وفات کے وقت آخری الفاظ یہ تھے'' میں موت سے نہیں گھبراتا - میں مسلمان ہوں-ہنسی خوشی موت کا استقبال کروں گا''-

میرے دوست اور فلسفیانہ شاعری کے آفتاب جناب ڈاکٹر شیخ سر اقبال صاحب نے جمعرات کے دن ۱۹ صفر ۱۳۵۷ھ صبح صادق کے وقت اس دنیا سے کوچ فرمایا - وہ چونکہ محبّ اہل بیت تھے اور تفضیلی عقائد رکھتے تھے ، اس لیے قدرت نے ان کو چہلم سیدالشہدا علیہ السلام سے ایک دن پہلے کی تاریخ عطا فرمائی -

ہندوستان کے ہر باشندے نے چھوٹا ہو یا بڑا اس صدمے کو قومی اور ملکی صدمہ محسوس کیا ، اور ہندوستان کے باہر بھی ایک تہلکہ برپا ہو گیا جس سے ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے-

مرحوم جب تعلیم کے لیے یورپ جا رہے تھے تو درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں حاضر ہوئے تھے اور ایک نظم بھی نذر کی تھی جس کے حسب ذیل اشعار بہت مقبول ہوئے تھے ۔

ہند کا داتا ہے تو ، تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے
محو اظہار تمنائے دل ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہمنام ہوں

اس سفر کے وقت مرحوم کے ساتھ میر نیرنگ صاحب وغیرہ شعراء بھی تھے جو سب جمع ہو کر مرزا غالب کے مزار پر گئے تھے ، اور میں نے دلی کے مشہور قوال ولایت خان کو بلوایا تھا - ولایت خان اس وقت نو عمر لڑکا تھا - سر محمد اقبال نے غالب کی لوح مزار کو دونوں ہاتھوں کے حلقہ میں لے کر سر جھکا لیا تھا اور ولایت خان نے غالب کی یہ غزل گائی تھی ۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اس شعر کو ولایت خان نے اس طرح ادا کیا تھا کہ سب پر ایک الم کا کیف طاری تھا- مگر آج جب اقبال کے مرنے کی خبر آئی تو ولایت خان قوال نے جواب بوڑھا ہو گیا ہے ، دلی ریڈیو میں خود اقبال کی ایک غزل گائی اور ایسے درد انگیز لہجہ میں کہ سب سننے والے رونے لگے-

آج رات کو پروفیسر مرزا سعید صاحب ایم - اے نے دہلی ریڈیو میں مرحوم اقبال کی

نسبت ایک بہت اچھا مضمون سنایا تھا جس کے بعد ریڈیو والوں نے خبریں سناتے وقت کہا کہ مرحوم اقبال نے اپنے قدیمی خدمت گزار نوکر الٰہی بخش (صحیح علی بخش) کی گود میں جان دی - یہ سن کر مجھ پر بہت اثر ہوا، اتنا اثر جو گورنر پنجاب اور سر ٹیگور اور کانگریس اور مسٹر جناح کے بیانات سے بھی نہیں ہوا تھا کیونکہ آقا اور نوکر کی یہ وفاداریاں اور باہمی الفتیں اب خواب و خیال ہو گئی ہیں - ہر چیز میں ظاہر داری اور نمائش ہوتی ہے، دلی تعلق بہت کم ہوتا ہے - پس مجھ پر اثر اس لیے ہوا کہ اقبال سچ مچ ہماری مٹنے والی تہذیب کی ایک نشانی تھے جن کے مستقل طرزِ عمل اور برتاؤ نے ان کے نوکر الٰہی بخش (علی بخش) کو ایسا گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ آخر وقت تک ساتھ رہا؛ اس لیے میں نے تعزیت نامہ الٰہی بخش (علی بخش) کو بھیجا ہے، مرحوم کی اولاد کو نہیں بھیجا - اولاد کے پاس میں خود ماتم پرسی کرنے جاؤں گا - اس وقت تو خطاب کے قابل میں نے الٰہی بخش (علی بخش) نوکر کی محبت دیکھی، کیونکہ میرے کان میں اقبال کی ایک آواز گونج رہی تھی: ''الٰہی بخش (علی بخش) حقہ بھر لا - اندر سے جاوید کو لا، خواجہ صاحب سے ملا''-
اقبال کے مرنے سے ہندوستان ہی سونا نہیں ہو گیا، بلکہ ایشیا بھر میں اندھیرا چھا گیا - ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال تمام ایشیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے اقبال کی قدر کی اور پانچ سو روپے ماہوار پیش کرتے تھے - امید ہے کہ مرحوم کے اہل و عیال کو بھی نواب صاحب فراموش نہیں کریں گے''-

(حسن نظامی، ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء)

حواشی

۱- علامہ اقبال کو علی گڑھ کالج اور بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ادارہ بے حد عزیز تھا- انہوں نے یہاں کئی مرتبہ خطبہ بھی دیا - یونیورسٹی کی طرف سے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی ملی تھی - موصوف کی ایک طویل نظم '' مخزن '' لاہور جلد ۱۳ شمارہ ۴ (ص ۵۷) بابت جون ۱۹۰۷ء میں ایڈیٹر صاحب کے طویل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی - یہ نوٹ نہایت اہم ہے اور لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے-نظم کا عنوان ہے ''طلبائے علی گڑھ کالج کے نام''-